اِعَانَۃُ النَّافِعُ

(نفع رساں کی مدد)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	خطبۂ ماثورہ	۷
۲	فضیلت طول قیام یا کثرت سجود	۸
۳	خواص کی غلطی	۸
۴	سلف کی خوبی	۹
۵	آج کل لوگوں کا حال	۹
۶	حضرت عمرؓ کی احتیاط	۱۰
۷	حق کی شان	۱۱
۸	امام صاحبؒ کا طلب علم	۱۱
۹	اہل کمال کا کمال	۱۲
۱۰	حکیم معین الدین صاحب کی حکایت	۱۲
۱۱	اختلاف مذاق	۱۳
۱۲	حضرت تھانویؒ کا حسنِ کلام	۱۴

۱۳	گوشہ نشینی کا اثر	۱۵
۱۴	عارف کی نظر	۱۷
۱۵	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقام معرفت	۱۸
۱۶	عارفین کا اندازِ نظر	۱۸
۱۷	ملکیتِ جسم	۱۹
۱۸	اپنی روح اور جسم کے مالک نہ ہونے کی وجہ	۲۰
۱۹	قربِ علمی	۲۱
۲۰	نقصِ عبادات	۲۲
۲۱	حقیقتِ عبادت	۲۳
۲۱	غُلوّ تقویٰ	۲۴
۲۳	لطیف نکتہ	۲۵
۲۴	دین میں غُلوّ کا نقصان	۲۵
۲۵	نعمتِ رخصت	۲۶
۲۶	احکامِ رخصت پر عمل ہی شکر ہے	۲۷
۲۷	توحید کے معنٰی	۲۷
۲۸	اشکال کا جواب	۲۸
۲۹	علمی رنگ میں غلطی	۲۸

۳۰	اخص الخواص کی غلطی	۲۹
۳۱	حقیقت تفویض	۳۱
۳۲	اقسام تفویض	۳۲
۳۳	توکل کی حقیقت	۳۲
۳۴	ترک اسباب کب جائز ہے	۳۴
۳۵	آخرت کے بارے میں ترکِ اسباب کا حکم	۳۴
۳۶	ارادے کی اقسام	۳۵
۳۷	اشکال کا جواب	۳۵
۳۸	ارادہ محمود اور ارادہ مذموم	۳۶
۳۹	ارادہ اور توکل	۳۷
۴۰	تفویض الی الشیخ	۳۸
۴۱	مریض کی ذمہ داری	۳۸
۴۲	انبیاء علیہم السلام کی ذمہ داری	۳۹
۴۳	فکرِ خاص کا درجہ	۴۰
۴۴	نظر وفکر	۴۱
۴۵	اپنی ذمہ داری کو دوسرے پر ڈالنے کی بُری عادت	۴۲
۴۶	اپنے عیوب کی فکر اور اصلاح کی کوشش	۴۳

۴۷	طالبِ اصلاح کی ذمہ داری	۴۴
۴۸	اصول مشائخ	۴۵
۴۹	طریق بزرگاں	۴۶
۵۰	امالہ رذائل	۴۷
۵۱	طلب اشرف	۴۹
۵۲	اعانت شیخ	۵۰
۵۳	نفئ جبر	۵۱
۵۴	مسئلہ تقدیر	۵۲
۵۵	ادراک محسوسات	۵۵
۵۶	طریق انبیاء علیہم السلام	۵۵

وعظ

اِعَانَۃُ النَّافِعْ

(نفع رساں کی مدد)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے یہ وعظ تفویض کی حقیقت کے بارے میں ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۳۵ھ بروز جمعہ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

سامعین کی تعداد تقریباً سو تھی۔ مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب نے اسے قلمبند فرمایا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده اللّٰہ فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا الٰه الا اللّٰہ وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا و مولٰنا محمدًا عبده ورسوله اما بعد: فقد قال النبى ﷺ فى حديث طويل ((فاعنّى على نفسك بكثرة السجود))(۱)

یہ طویل حدیث کا ایک جملہ ہے اس میں کسی صحابی کو خطاب ہے (۲) مجھے اس وقت یاد نہیں اور یہ مضمون پہلے سے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ ورنہ کتاب دیکھ لیتا کہ حدیث میں یہ خطاب کس کو فرمارہے ہیں اگر کاتب بعد میں مجھے یاد دلادیں گے تو اس وقت اسے لکھوادوں گا۔ مگر جتنا جزو مقصود ہے وہ اس وقت بھی مستحضر ہے (۳)۔

اور اس جزو کا حاصل یہ ہے کہ ایک صحابی نے آپ ﷺ سے شفاعت کی درخواست کی تھی آپ ﷺ نے شفاعت کا وعدہ فرمایا(۴) مگر ساتھ میں ان سے یہ بھی فرمایا کہ تھوڑا سا تم بھی سہارا لگانا کثرتِ سجود سے یعنی نماز سے مطلب یہ ہے کہ کثرت سے نماز پڑھنا تاکہ اس سے تم میں سفارش کی اہلیت اور قابلیت پیدا ہوجاوے اور میں

(۱) صحیح مسلم: ۱/۱۹۳(۱) وہ ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں: ۱۲ جامع (۲) ذہن میں حاضر ہے (۳) حدیث میں ''مرافقت فی الجنة'' کا سوال ہے اس کا طریقہ بھی سفارش ہی ہے اور حضور ﷺ نے اسی کا وعدہ فرمایا تھا ۱۲ جامع۔

تمہاری سفارش کرسکوں تو میری اعانت (۱) کثرتِ سجود سے کرنا۔

فضیلت طولِ قیام یا کثرتِ سجود

علماء کا اس مقام پر ایک اختلاف بھی ہے کہ طولِ قیام افضل ہے یا کثرتِ سجود (۲) یعنی رکعتیں مختصر مختصر کرکے تعداد میں زیادہ پڑھنا افضل ہیں یا یہ افضل ہے کہ رکعات تعداد میں خواہ کم ہوں مگر بہت طویل ہوں۔ غرض یہ مسئلہ مختلف فیہ (۳) ہے۔ مگر مجھے اس اختلاف کی بابت کچھ بیان کرنا نہیں دو وجہ سے اول تو اس وجہ سے کہ میرا یہ مقصود نہیں، دوسرے اس وجہ سے بھی کہ مولانا محمد یعقوب صاحب سے اس مسئلہ میں ایسا فیصلہ سن چکا تھا کہ جس سے مجھ کو دونوں مذہب میں کسی قسم کا اختلاف نہیں معلوم ہوتا اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر ایک دوسری سے من وجہ افضل ہے جس وقت جس کو دل زیادہ چاہے اور جس سے دلچسپی اور رغبت وشوق ہو اس پر عمل کریں جس وقت طولِ قیام مرغوب (۴) ہو اسے اختیار کرے اور جس وقت کثرتِ سجود محبوب (۵) ہو اس وقت اس پر عمل کرے حاصلِ فیصلہ یہ ہے کہ ہر ایک میں دوسرے کے اعتبار سے فضیلت ہے۔

خواص کی غلطی

بہرحال ان دونوں وجہ سے اس مسئلہ کی تحقیق اور تنقیح (۶) مقصود نہیں بلکہ مقصود بالبیان (۷) یہ ہے کہ اس حدیث میں حضور ﷺ نے ایک مسئلہ ضرور یہ بیان فرمایا ہے اور وہ مسئلہ حدیث سے ادنیٰ (۸) توجہ کے ساتھ مستنبط (۹) ہوتا ہے

(۱) مدد (۲) نماز میں لمبا قیام زیادہ باعثِ فضیلت ہے یا کثرتِ تعدادِ رکعات (۳) اس مسئلہ میں اختلاف ہے (۴) جس وقت نماز میں لمبا قیام کرنے کو دل چاہے تو وہ کرے (۵) جس وقت زیادہ رکعتیں پڑھنے کو دل چاہے تو وہ پڑھے (۶) وضاحت (۷) بیان کا مقصد یہ ہے (۸) تھوڑی سی توجہ (۹) نکل آتا ہے۔

کیونکہ یہ حدیث اس مسئلہ پر بدلالۃ النص دال (۱) ہے۔ مگر باوجود اتنی واضح دلالت کے اس مسئلہ کے سمجھنے میں اور اس پر عمل کرنے میں بہت کوتاہی کی جاتی ہے اور کوتاہی بھی عوام کی نہیں بلکہ خواص کی عوام کی کوتاہی تو اس قدر قابل اہتمام نہیں جس قدر خواص کی کوتاہی قابل اہتمام ہوتی ہے جس کی دو وجہ ہیں اول وجہ تو یہ ہے کہ خواص کی کوتاہی متعدی (۲) ہوتی ہے۔ برخلاف عوام کے کہ ان کی کوتاہی لازمی (۳) ہوتی ہے تو خواص کی غلطی کا اثر دوسروں پر بھی ہوتا ہے چنانچہ مشہور ہے۔ (زلّ العالِم زل العالَم) ''کہ عالم کی لغزش اور غلطی عالَم کے لئے لغزش اور غلطی ہے''

سلف کی خوبی

امام ابوحنیفہؒ کی حکایت ہے کہ ایک لڑکا تیزی کے ساتھ چلا جارہا تھا امام صاحبؒ نے فرمایا کہ صاحبزادے سنبھل کر چلو گر پڑو گے' وہ لڑکا بولا کہ آپ سنبھل کر چلیں اس لئے کہ آپ کے سنبھلنے سے عالَم سنبھل جاویگا اور آپ کے بگڑنے سے عالَم بگڑ جاویگا' اور میرے گرنے سے تو صرف مجھ ہی پر اثر ہوگا۔ امام صاحبؒ بچہ سے یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے ان حضرات میں یہ خوبی تھی کہ "لا تنظر الی من قال وانظر الی ماقال '' پر پورا عمل تھا یعنی وہ حضرات قائل کو نہیں دیکھتے تھے بات کو دیکھتے تھے کہ کس درجہ کی ہے۔

آج کل لوگوں کا حال

یہاں یہ کیفیت ہے کہ چھوٹوں کی بات پر تو کیا ہی عمل کرتے۔ چھوٹوں کی باتوں کو تو کان لگا کر سنتے بھی نہیں۔ بلکہ بڑوں کی باتوں کو بھی نہیں سنتے اور بڑوں کے

(۱) حدیث کے الفاظ ہی اس پر دلیل ہیں (۲) خواص کی خرابی کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے (۳) صرف ان کی ذات تک محدود ہوتی ہے۔

ارشاد پر بھی عمل نہیں کرتے ایک مولوی صاحب مفتی تھے فرماتے تھے کہ میرے پاس جب کوئی فتویٰ بغرض تصحیح آتا ہے تو میرا جی دستخط کرنے کو نہیں چاہتا۔ بلکہ حتی الوسع اسی کی سعی رہتی ہے کہ مخالفت کروں(۱)۔ ہمارا یہ مذاق ہوگیا ہے اللہ اکبر کہ حق کی موافقت سے بھی عار ہے۔

اب تو مرید بھی پیروں پر رد وقدح(۲) کرنے لگے۔ حالانکہ یہ فرقہ سب سے زیادہ فانی اور مؤدب تھا(۳)۔ مگر اب تو وہ بھی یوں چاہتے ہیں کہ ہماری ہی بات غالب رہے۔ چنانچہ شیخ اگر کسی بات پر تنبیہ کرے اولاً تو اپنی خطا کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اور اگر تسلیم بھی کر لیتے ہیں تو صاف اقرار غلطی کا نہیں کرتے بلکہ منشا اشتباہ(۴) کو ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں جس سے غلطی میں بُعد (۵) نہ رہے اور سبکی (۶) نہ ہو۔ افسوس آج کل یہ کیسا مادہ پیدا ہوگیا ہے کہ اپنی بات بنانے اور اپنے پہلو کو اونچا رکھنے کا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی احتیاط

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے ''وکان وقافا عند کتاب اللّٰہ'' یعنی کسی ایسی تحقیق کے بعد جس میں آپ کے قول کا نص (۷) سے تعارض بھی نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص کتاب اللہ کی آیت پڑھ دیتا تو آپ ادب سے فوراً سکوت (۸) فرما لیتے تھے۔ اور عدم تعارض کو ظاہر کر کے بھی جواب نہ دیتے تھے کیونکہ وقاف مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی وہ حق پر بہت زیادہ توقف کرنے والے تھے' بہت زیادہ کے یہی معنی ہیں چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعات سے یہ عادت ثابت ہے۔

(۱) اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کروں (۲) اعتراض (۳) شیخ کی محبت میں ڈوبا ہوا اور باادب تھا (۴) شبہہ کی وجہ کو (۵) دوری نہ رہے (۶) شرمندگی (۷) آپ کا قول قرآن وحدیث کے خلاف بھی نہ ہوتا تھا (۸) خاموشی۔

حق کی شان

اور حق کی تو شان یہی حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾(۱) ''کہ جب حق آتا ہے تو باطل جاتا رہتا ہے پھر باطل جاتا رہتا ہے'' پھر باطل کا تو رہنا ہی مناسب نہیں، حتیٰ کہ یہ بھی مناسب نہیں کہ باطل صورتاً بھی رہے۔

صاحبو! باطل کی تو ہر صورت سے اماتت (۲) کرنی چاہئے کہ نہ وہ حقیقتاً ہی رہے نہ صورتاً۔

امام صاحبؒ کا طلبِ علم

سلفِ صالحین کی یہ حالت تھی کہ بچے سے نصیحت سن کر متاثر ہو جاتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ منیٰ میں ایک حجام سے مجھے تین مسئلے معلوم ہوئے جو مجھے پہلے سے معلوم نہ تھے۔ یہ امام صاحبؒ کی کس درجہ خوبی ہے کہ نائی سے بھی مسائل معلوم کرنے میں عار نہیں فرمایا کیونکہ مقصود احکام کا معلوم کرنا ہے چاہے حجام (۳) سے معلوم ہوں یا کسی اور سے۔

اس پر بعض معاند لوگوں نے اعتراض کیا ہے اور اس سے امام صاحبؒ کے نقص علمی پر استدلال کیا ہے افسوس ہے کہ اس کمال کی یہ قدر کی گئی اس سے کسی صورت سے بھی تو امام صاحبؒ کے علم کی کمی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ جس نے نائی تک سے بھی علم کے لینے میں عار نہیں کیا۔ اس کی طلب کا حال اس سے معلوم ہو گیا کہ اس نے کسی عالم کو تو کیوں چھوڑا ہوگا۔ یقیناً ہر عالم سے علم لیا ہوگا۔ اسی لئے امام صاحبؒ کے شیوخ چار ہزار کے اوپر ہیں البتہ اس واقعہ سے اس نائی کا بھی عالم ہونا معلوم ہوتا ہے، مگر امام صاحب کے سامنے اس کا علم ایسا تھا کہ تمام فقہا و محدثین

(۱) سورۂ بنی اسرائیل: ۸۱ (۲) باطل کو تو ظاہری اور باطنی دونوں طرح ختم کرنا چاہئے (۳) نائی۔

واکابر علماء نے امام صاحب کے مناقب میں کتابیں لکھی ہیں اور اس نائی کی منقبت(۱) میں کسی نے بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔

اہلِ کمال کا کمال

اصل یہ ہے کہ ''المرء یقیس علی نفسه''(۲) چونکہ یہ معترضین خود اس نائی سے بھی کم علم ہیں اس لئے امام صاحبؒ کی کمی علم پر استدلال کرتے ہیں حالانکہ یہ دلیل ہے امام صاحبؒ کے کمال کی ایسے جہلاء کی تنقیص(۳) سے کیا ہوتا ہے۔ امام صاحبؒ کا حسن خداداد ہے کسی کے عیب لگانے سے کیا ہوتا ہے اور اسی واسطے امام صاحبؒ نے صاف بیان کردیا کہ مجھے حجام سے نفع ہوا اس سے عار نہیں کیا۔ کیونکہ اہلِ کمال کے کمال پر ان باتوں سے دھبہ نہیں آیا کرتا وہ اس کی کوشش نہیں کرتے کہ ان کو کوئی بڑا سمجھے۔

حکیم معین الدین صاحب کی حکایت

اس کے مناسب ایک حکایت یاد آگئی کہ حکیم معین الدین صاحب نانوتوی میرٹھ میں حافظ عبدالکریم صاحب رئیس کے یہاں اتفاقاً تشریف لے گئے۔ حافظ صاحب موصوف نہایت ہی بھولے بھالے تھے۔ کسی کو بارہا دیکھ کر بھی دیر میں پہچانتے تھے، چنانچہ میں بچپن سے اپنے والد صاحب کے ساتھ میرٹھ انہیں کے یہاں رہا۔ مگر جب ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا تو میں تعزیت کے لئے میرٹھ گیا اور حافظ صاحب سے جا کر ملا، اس وقت اور لوگ بھی تھے۔ تو وہ دریافت کرتے ہیں کہ آپ کی تعریف(۴)؟ کسی نے کہا کہ اشرف علی ہیں تب وہ مجھ

(۱) اس نائی کی شان میں (۲) انسان اپنے اوپر دوسروں کو قیاس کرتا ہے (۳) ان جاہلوں کی عیب جوئی سے کیا ہوتا ہے (۴) آپ کون ہیں؟

سے ملے۔ اسی طرح حکیم معین الدین صاحب حافظ صاحب کے پاس تشریف لے گئے تو حافظ صاحب نے ان سے بھی دریافت کیا کہ آپ کون ہیں؟ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ میں جولاہا ہوں حافظ صاحب نے فرمایا کہ آپ کا مکان کہاں ہے؟ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ چھوٹے شہر، تھوڑی دیر کے بعد مولوی رعایت الحق صاحب جوان کی ریاست کے مدارالمہام (۱) تھے تشریف لائے جو حکیم صاحب کو جانتے تھے۔ وہ صاحب حکیم صاحب سے تپاک سے ملے، اس وقت حافظ صاحب کو شبہہ ہوا کہ یہ کون صاحب ہیں جن سے اس قدر تپاک سے مولوی صاحب نے ملاقات کی۔ چنانچہ انہوں نے دریافت کیا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ یہ حکیم معین الدین صاحب ہیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے صاحبزادے، تب حافظ صاحب کو پتہ لگا اور حکیم صاحب سے فرمایا کہ آپ تو یہ فرماتے تھے کہ میں جولاہا ہوں۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ جب جناب نے مجھ سے دریافت کیا تو بھلا میں اپنے منہ سے کیا کہتا کہ میں فلاں ہوں اگر آپ نہ پہچانیں تو کیا کہوں۔ دیکھئے حکیم صاحب چونکہ صاحبِ کمال تھے تو ان کو جولاہا کہنے سے عار نہ آیا ورنہ اپنے کو جولاہا کون کہتا ہے الا ماشآءاللہ۔

اختلافِ مذاق

ہمارے حضرات کا تو یہی مذاق ہے مگر بعض کا دوسرا مذاق ہے وہ ایسے مواقع میں تواضع کو نامناسب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالرب صاحب واعظ دہلوی ایک امیر کے یہاں مہمان ہوئے۔ مولوی صاحب کو کسی وقت رات میں رفع حاجت (۲) کی ضرورت ہوئی میزبان کے یہاں دو پاخانہ تھے ایک عام دوسرا خاص، چونکہ مولوی صاحب مہمان خاص تھے خاص پاخانہ میں جانے لگے محافظ نے

(۱) ایسا شخص جس پر امور سلطنت کا دارومدار ہو (۲) بیت الخلاء جانے کی ضرورت پیش آئی۔

ٹوکا کہ کون؟ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ اگر میں اس وقت تواضع کرتا تو نہ معلوم کیسی پریشانی ہوتی۔ اس لئے میں نے ذرا سخت لہجہ میں جواب دیا کہ ہم ہیں مولانا صاحب دہلی والے تو ہمیں جانتا نہیں دیکھ صبح کو تیری کیسی خبر لی جاتی ہے' وہ ہاتھ جوڑنے لگا کہ معاف کردیجئے میں نے پہنچانا نہیں۔ اس کے بعد مولوی صاحب فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر اسی طرح بے باکانہ بات کہنی چاہئیے اور دیوبند کے مولویوں کی طرح تواضع نہ کرنا چاہئیے۔ ورنہ اس وقت اگر میں کہتا کہ میں ہوں حقیر فقیر ذرّہ بیمقدار تو گو بعد میں کچھ ہی ہوتا۔ مگر اس وقت تو پریشانی ضرور ہی ہوتی۔ مگر صاحبو ایسی ہمت مولوی صاحب ہی کی تھی ہر شخص اپنے منہ سے اس طرح نہیں کہہ سکتا۔

حضرت تھانویؒ کا حسنِ کلام

چنانچہ مجھے بھی کانپور میں ایک مرتبہ اتفاق ہوا صاحب جنٹ کے اجلاس پر جانے کا' کیونکہ ایک فتویٰ پر میں نے دستخط کردیئے تھے۔ وہ مقدمہ اٹھارہ برس سے عدالت میں تھا اور کوئی فیصلہ نہ ہوتا تھا۔ دستخط کرنے والے علماء میں سے جس عالم پر ایک فریق رضامند ہوتا تو فریق ثانی انکار کردیتا مجھ پر فریقین نے رضامندی ظاہر کی چنانچہ میرے نام سمن آیا اور مجھے جانا پڑا مجھ سے سوال کیا گیا کہ آپ عالم ہیں اس وقت مجھے بیحد خلجان (۱) ہوا۔ اگر انکار کروں تو وکلاء اور حکام تواضع کو کیا جانیں کہ یہ انکار تو اضعاً ہے چنانچہ ایسے اتفاقات ہوئے ہیں کہ لوگوں نے تو اضعًا انکار کیا اور وہ واقعی انکار سمجھے اور اگر یہ کہوں کہ عالم ہوں تو اولاً تو اپنی وضع کے خلاف ہے اور ثانیاً یہ ہے کہ عالم ہوں کہاں۔ ان دونوں پہلوؤں پر نظر کرکے میں نے جواب دیا کہ مجھے مسلمان ایسا ہی سمجھتے ہیں اور چند سوالات ایسے ہی پیچیدہ

(۱) بہت پریشانی ہوئی۔

کئے گئے۔ میں نے سب کے جواب میں مصلحت وقت کو اور اپنی وضع کو پوری طرح ملحوظ رکھا' وکلاء نے باہر آ کر مجھ سے کہا کہ ماشاء اللہ بہت اچھا جواب دیا' اس وقت تو ہم بھی چکر میں آ گئے تھے کہ دیکھئے اس کا کیا جواب ہوتا ہے غرض اپنے منہ سے تو مولوی عبدالرب صاحب کی طرح یہ کہنا کہ میں عالم ہوں مجھے بہت مشکل تھا۔ ہاں ایسی بات کہدی جس سے دعوی علم بھی نہ ہوا اور مصلحت بھی فوت نہ ہوئی۔

گوشہ نشینی کا اثر

اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ باوجود قلتِ تجربہ(۱) کے ضروری مصالح کے طریقے ذہن میں آجاتے ہیں۔ غرض ہماری جماعت کے لوگ سیاح تو نہیں ہیں گوشہ نشین ہیں (۲) باوجود گوشہ نشینی کے ضروریات دنیویہ کا علم بھی حق تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اور اس سے غفلت نہیں' ہم لوگوں پر گوشہ نشینی کی وجہ سے عیب لگایا جاتا ہے اور اس گوشہ نشینی پر یہ کہا جاتا ہے کہ بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ کانپور میں مجھے ایک صاحب سے گفتگو کا اتفاق ہوا انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کو دنیا کی کیا خبر آپ تو بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم شیطان کے گنبد میں بیٹھے ہو تہذیب سے گفتگو کرو۔ کیا ان الفاظ سے بسم اللہ کی اہانت نہیں ہوتی؟ توبہ کرو' اور بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھنے سے جو یہ مقصود ہے کہ دنیا کی ضرورتوں کی خبر نہیں اول تو یہ مسلّم (۳) نہیں کہ گوشہ نشینوں کو دنیا کی ضروری خبر بھی نہیں۔ بلکہ گوشہ نشینی میں بھی دنیا کی ضروری خبر ہوسکتی ہے ثانیاً علی تقدیر التسلیم (۴) خود دنیا کی خبر ہی کی کیا ضرورت ہے جیسے کسی نے کہا تھا کہ تشدید

(۱) تجربہ کی کمی کے باوجود (۲) سیر و تفریح کے دلدادہ نہیں بلکہ ایک کونے میں بیٹھ کر اللہ کی یاد میں مشغول ہیں (۳) یہ بات قابل تسلیم نہیں (۴) دوسرے اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ دنیا سے واقفیت کی ضرورت ہی کیا ہے۔

بضرورت شعر آ گیا' دوسرے نے کہا کہ ''شعر گفتن چہ ضرور'' (۱) اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ ؎

خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است
چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت ست (۲)

لیکن باوجود ایسی خبروں کی حاجت نہ ہونے کے واقعہ یہی ہے کہ ان عارفین گوشہ نشینوں کو دنیا کا بھی علم بقدرِ ضرورت ہوتا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ خلوت نشینی اور مراقبات سے قلب میں توجہ الی اللہ (۳) اور اس سے نور پیدا ہوتا ہے اور جب قلب (۴) میں نور پیدا ہوگا تو قلب کے سامنے جو شئے واقع ہوگی منور اور روشن وظاہر ہوجاوے گی۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آئینہ آفتاب کے سامنے ہو' مگر کوئی شئے آئینہ آفتاب کے درمیان حائل ہو تو اس صورت میں آئینہ کی تاریکی لازم ہے لیکن جب وہ حائل منتفی (۵) ہوجاوے اور آفتاب کا عکس آئینہ پر پڑے تو آفتاب کے ضیاء (۶) سے جو چیزیں آئینہ کے مقابل ہیں وہ بھی سب آئینہ میں منعکس (۷) ہوجاویں گی۔ اور ان چیزوں کا منعکس ہونا اختیار سے نہیں اور نہ کسب کو اس میں دخل ہے بلکہ جب قلب منور ہوگا تو بلا اختیار خود حقائق کا انکشاف ہوگا۔

---

(۱) کسی شاعر نے ہر شعر میں تشدید کا اضافہ کیا تو جب اس سے پوچھا گیا کہ تم نے اس جگہ تشدید کیوں لگائی کہنے لگا ضرورتِ شعری کی وجہ سے تو اس کو دوسرے نے کہا شعر کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے (۲) خلوت میں بیٹھنے والے کو کھیل تماشے سے کیا مطلب جو محبوب کے کوچہ میں بیٹھا ہو اس کو محبوب کی تلاش میں جنگلوں میں پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں (۳) تنہائی میں بیٹھ کر مراقبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی توجہ حاصل ہوتی ہے (۴) دل (۵) جب وہ حائل ہٹ جائے (۶) سورج کی روشنی (۷) شیشہ میں ان کا عکس نظر آئے گا۔

عارف کی نظر

یہاں پر یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اس تقریر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ توجہ الی اللہ سے تمام اشیاء کا علم ہوجاوے گا۔ حالانکہ بظاہر تو یہ ہے کہ جب خدا کی معرفت ہو تو غیر اللہ سے ذہول (۱) ہوجاوے اور خدا کی معرفت کے سامنے غیر اللہ کی معرفت فنا ہوجاوے تو اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ حیثیات اور اعتبارات مختلف ہیں۔ ایک حیثیت اور ایک اعتبار سے مخلوقات اور غیر اللہ کا بتمامہا علم ہوجاتا ہے۔ استقلال اور تبعیت میں فرق ہے استقلال کی حیثیت سے تو ذہول ہوجاتا ہے درجہ تبعیت کے دوسرے حقائق پر بھی نظر ہوجاتی ہے یعنی عارف کی استقلالاً (۲) تو خدا ہی پر نظر ہوتی ہے غیر اللہ پر استقلالاً نظر نہیں ہوتی باقی تبعاً مخلوقات کا علم اور غیر اللہ پر بھی نظر ہوسکتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے عام ناظرین کو کسی مکان کو دیکھ کر صانع (۳) کا خیال ہو تو اس صورت میں مکان پر تو نظر استقلالاً ہے اور صانع پر تبعاً (۴) ہے اور ہم لوگوں کو یہی حالت ہے کہ کھانے وغیرہ پر مثلاً استقلالاً نظر ہوتی ہے اور باورچی وغیرہ کی طرف تبعاً اگر ان اشیاء پر استقلالاً نظر نہ ہوتی۔ محض بطور تبعیت ہوتی تو ان اشیاء کے فوت ہونے پر ملال نہ ہوتا۔ حالانکہ ان اشیاء کے فوت ہونے پر ملال متیقن (۵) ہے لہذا واضح طور پر ظاہر ہوگیا کہ ان اشیاء پر ہماری نظر استقلالاً ہے۔

---

(۱) غیر سے توجہ ہٹ جاتی ہے (۲) مستقلاً (۳) بنانے والے کا (۴) مکان کو تو مستقلاً دیکھ رہا ہے اور اس کے بنانے والے پر اس کے واسطے سے نظر ہے (۵) ان چیزوں کے ضائع ہونے پر افسوس یقینی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقامِ معرفت

مگر عارفین کی نظر بالعکس ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نظر حق تعالیٰ پر استقلالاً تھی اسی لئے حضور کی وفات کے بعد فرمایا تھا۔(الا ان من کان منکم یعبد محمدا فانه قد مات ومن کان یعبد اللّٰه فانه حی لا یموت) ''کہ جو تم لوگوں میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔ تو آپ کی تو وفات ہوگئی اور جو خدا کی عبادت کرتا تھا تو وہ زندہ ہیں کبھی نہ مریں گے'' تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات نبوی کے بعد یہ ارشاد فرمایا تھا۔ جس سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظر استقلالاً خدا تعالیٰ کی طرف تھی۔ صوفیاءِ کرامؒ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایک حکایت بھی نقل کی ہے کہ آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ (هل عرفت ربّك بمحمد ام عرفت محمدا بربّك) ''کہ آپ نے خدا کو حضور کی وجہ سے پہنچانا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کے ذریعہ سے پہچانا ارشاد فرمایا کہ (بل عرفت محمدا بربی) یعنی'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی وجہ سے پہچانا''۔

مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ''من حیث الاستقلال'' نہیں ''بل من حیث انه رسول اللّٰه'' ہے تو توحید کامل یہی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ہے۔

عارفین کا اندازِ نظر

عارف کسی چیز پر بالاستقلال نظر نہیں کیا کرتا نہ استقلالاً کسی چیز کو سمجھتا ہے، بلکہ ہر چیز کو خدا تعالیٰ کی ملک سمجھتا ہے اور ہر چیز میں اول خدا کو دیکھتا ہے پھر اسی شئی کو دیکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر سر میں درد اور ضعف ہو تو اس حیثیت سے

خمیرہ گاؤزبان کھانا بھی ثواب اور اجر رکھتا ہے کہ یہ ہمارا سر نہیں بلکہ سرکاری مشین ہے۔ پس اس حیثیت سے تمام لذات وتمتعات(۱) میں ثواب ہے' صرف حیثیت اور جہت کا فرق ہے اسی فرق سے اجر اور عدم اجر کا فرق ہوگیا۔

ملکیتِ جسم

اسی سے حرمتِ قتل(۲) کا راز معلوم ہوگیا' یعنی ہم کو حکم ہے کہ خودکشی نہ کرو اگر کسی نے خودکشی کی اور اپنے کو قتل کیا تو جرم کا مرتکب ہوا کیونکہ یہ ہمارا بدن ہماری چیز نہیں اسی وجہ سے خودکشی حرام ہے جیسا کہ کمیرے(۳) کو ہل توڑنے کا اختیار نہیں ہے ہاں ہل چلانے کا اختیار ہے اسی طرح ہمیں صرف اس جسم سے کام لینے کا اختیار ہے۔ مثلاً جو غلام ہماری ملک ہو اس کو ہماری منشاء کے مطابق چلنے کا اختیار ہے یہ ہرگز اختیار نہیں کہ زہر کی بُوٹی کھا کر مرجاوے اگر اس نے ایسا کیا تو اس نے ہماری خیانت کی اسی طرح چونکہ ہمارا بدن اور جسم ہماری چیز نہیں سرکاری چیز ہے اور اس لئے اس حیثیت سے اس کی خدمت وغیرہ میں بھی ثواب ہے اور اسی جہت(۴) سے ان کی ساتھ محبت بھی ہونا چاہئیے۔ اسی کو کسی صاحبِ حال نے فرمایا ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است(۵)

یعنی اپنے ہاتھ پیروں پر بھی ناز کرتا ہوں اس واسطے کہ اس سے آپ تک وصول ہوا ہے نہ اس وجہ سے کہ میری چیز ہے آگے فرماتے ہیں ؎

ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش کودامنت گرفتہ بسوئم کشیدہ است (۶)

---

(۱) ہر لذیذ اور قابلِ انتفاع میں ثواب ہے (۲) خودکشی حرام ہونے کی وجہ معلوم ہوگئی (۳) کسان کے تحت کام کرنے والے نوکر چاکر مزدور وغیرہ (۴) اس حیثیت سے (۵) مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ جن سے میں نے اپنے محبوب کا جمال دیکھا اپنے قدموں کے قربان کہ جو تیرے کوچے میں لے جاتے ہیں (۶) ہر گھڑی اپنے ہاتھوں کو ہزاروں بوسے دیتا ہوں جنہوں نے تیرے دامن کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ہے۔

اور یہاں سے ''جسدك عليك حقا ''(۱) کے راز کا پتہ چل گیا کہ ہمارے جسم کا ہم پر اس وجہ سے حق ہے کہ وہ سرکاری چیز ہے ہماری ملک نہیں البتہ اس پر یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اگر ہمارا جسم ہماری ملک نہیں تو ''جسدك'' میں پھر اضافت کیسی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اضافت پتہ کے واسطے ہے تملیکی نہیں (۲) جیسے ہمارا باپ وغیرہ کہ ان چیزوں میں اضافت پتہ کے واسطے ہوتی ہے ملک کے لئے نہیں اسی طرح ''جسدك ''(۳) میں بھی اضافت پتہ کے واسطے ہے چونکہ وہ ہمارا جزو ہے اس لئے ہماری طرف اضافت کردی۔ باقی وہ مِلک خدا کی ہے ہم کو صرف تصرّف کا اختیار ہے وہ بھی اس قید سے کہ مرضیٔ مالک کے موافق اس سے جو چاہیں کام لیں باقی اس کے ہلاک اور فنا کرنے کا ہم کو اختیار نہیں۔

اپنی روح اور جسم کے مالک نہ ہونے کی وجہ

اور جسم و روح کا ہماری مِلک نہ ہونا ایک عقلی راز سے بھی ثابت ہے کیونکہ محل ملک وہ چیزیں ہوتی ہیں جو ہم سے بعید (۴) ہوں اور جس چیز کو ہم سے غایت قرب (۵) ہے وہ ہماری ملک نہیں اور جتنی زیادہ قریب ہوگی اسی نسبت سے ہماری ملک سے بعید (۶) ہوگی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ سب چیزوں کی نسبت جان سب سے زیادہ قریب ہے اور اسی لئے وہ ملک سے بہت بعید (۷) ہے کہ آدمی اپنا کسی صورت سے مالک نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ذی رحم محرم (۸) گو جان سے بعید ہے مگر اجانب سے قریب ہے تو ذی رحم محرم اشتراء سے ملک تو بن جاتا ہے مگر ملک

(۱) تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے (۲) ملکیت ظاہر کرنے کے لئے نہیں ہے (۳) تیرا جسم (۴) ہم سے دور ہوں (۵) بہت زیادہ قربت ہو (۶) جتنا ہم سے قریب ہوں گی اتنا ہی ہماری ملکیت سے دور ہوں گی (۷) ملکیت سے دور ہے (۸) وہ عزیز جن سے ہمیشہ نکاح حرام ہوتا ہے جیسے بہن بھائی بھانجا بھتیجا وغیرہ۔

میں باقی نہیں رہتا فوراً آزاد ہوجاتا (۱) ہے پس اس بناء پر ہم اپنے مالک نہیں اس لئے ہم کو اپنے اندر ہر تصرف جائز نہیں۔

قربِ علمی

یہاں پر ایک شبہہ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ تو بندے سے بہت زیادہ قریب ہیں تو تقریر بالا (۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بندہ کے مالک نہ ہوئے۔ حالانکہ خدا کی ملکیت مسلّمات (۳) سے ہے اور بدیہی طور پر ثابت ہے۔

تو اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جو بندہ کے قریب ہیں۔ اس قرب سے قربِ علم یا رضا مراد ہے قربِ حسی مراد نہیں اس لئے کہ قربِ حسی جانبین سے ہوتا ہے کیونکہ ایک شئے جب کسی شئے سے حساً قریب ہوگی تو لامحالہ وہ شئے بھی اس سے قریب ہوگی اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرب جانبین سے نہیں ہے چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ (۴) یہاں ''انتم اقرب الیه ''(۵) نہیں فرمایا۔ ﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ﴾ فرمایا یعنی ہم بہت قریب ہیں تو معلوم ہوا کہ قرب خدا کی طرف سے ہے ہماری طرف سے نہیں پس یہاں اس قرب سے قرب علمی مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ اس آیت میں ﴿نَعْلَمُ﴾ پر قرب کو مرتب فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس قرب سے مراد قربِ علمی ہے یعنی جیسا خدا کو علم ہے بندے کا' بندے کو اس کا ذرّہ بھر بھی نہیں باقی حقیقت کے اعتبار سے حق تعالیٰ کو بندے سے بہت

(۱) اسی لئے اگر کوئی ایسے غلام کو خریدے جو اس کا ایسا رشتہ دار ہو جن سے نکاح حرام ہے تو وہ اس کی ملکیت میں آتو جائے گا لیکن فوزا آزاد ہوجائے گا لیکن آج کل غلام نہیں پائے جاتے (۲) مذکورہ تقریر سے (۳) ثابت شدہ ہے (۴) ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں سورۂ قٓ: ۱۶ (۵) ''تم اس کے قریب ہو'' نہیں کہا۔

بُعد (۱) ہے وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء (۲) ہے بندہ کو اس سے کیا نسبت یہ تو اسکا تصور صحیح بھی نہیں کرسکتا۔ (کل ما خطر ببالك فهو هالك والله اعزو اعلى من ذالك) (۳)

اے برادر بے نہایت در گہے است ہر چہ بروے میرسی بروے مایست (۴)

حق تعالیٰ بندے کے علم وادراک سے دور سے بھی دور ہیں بلکہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں (۵)۔ غرض خدا کو بندے سے قربِ علمی ہے اور قرب خدا کو بندے سے ہے بندے کو ہرگز نہیں یعنی حق تعالیٰ تو بندے کی کُنہ (۶) سے واقف ہیں اور ان کو بندے کا علم بکنہہ ہے اور بندہ خدا کی کُنہ سے واقف (۷) نہیں۔ چنانچہ کسی کو خدا کا علم بکنہہ نہیں ہوتا۔ البتہ علم بوجہہ (۸) ہوتا ہے اور بوجہہ بھی بدرجہ بعید۔

چنانچہ بندے کو خدا کا علم بواسطہ وجہ الوجہ بلکہ وجہ وجہ الوجہ کے ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا علم بندے کی قدرت میں نہیں اس لئے بندے کو علم بکنہہ کا مکلّف نہیں کیا گیا۔

نقصِ عبادات

اور یہاں سے ہماری عبادات کا ناقص ہونا بھی واضح ہوگیا۔ کیونکہ تمام عبادات عقلاً موقوف ہیں علم بمعبود پر یعنی طاعات اور عبادات اسی وقت کامل ہوتی ہیں جب معبود کا علم پورے طور سے ہو مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں تو

(۱) ذات کے اعتبار سے بہت دوری ہے (۲) اللہ کی ذات تو انسان کے تصور سے بھی پرے سے پرے ہے (۳) اللہ کی جو بھی شکل تم سوچتے ہو وہ ختم ہونے والی ہے اور اس کی ذات تو اس سے بہت اعلیٰ و بلند تر ہے (۴) اے بھائی! اللہ کی صفات کی کوئی حد نہیں ہے جہاں تک میری عقل کی رسائی ہے وہ اس سے بھی ماوراء ہے (۵) حق تعالیٰ کی ذات بندے کی سمجھ سے بہت بلند وبرتر ہے (۶) اللہ بندے کی حقیقت کو جانتے ہیں (۷) بندہ اللہ کی حقیقت کو نہیں پاسکتا' سچ کہا ہے

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا میں جان گیا بس تیری پہچان یہی ہے

(۸) بلکہ اس کے وجود کے دلائل سے اس کو پہنچانتا ہے۔